رسائل و مسائل

قصصِ سلیمانؑ و یوسفؑ کے بعض اشکالات

جناب ملک غلام علی صاحب۔ منصورہ

سوال:۔ درج ذیل اشکالات پیش کر کے رہنمائی کا طالب ہوں۔ اُمید ہے جواب سے نوازیں گے

۱۔ سورۃ السبا کی آیت نمبر ۱۴ کا ترجمہ تفہیم میں یوں ہے۔ "پھر جب سلیمانؑ پر ہم نے موت کا فیصلہ نافذ کیا تو جنوں کو اس کی موت کا پتہ دینے والی کوئی چیز، اُس گھن کے سوا نہ تھی جو اُس کے عصا کو کھا رہا تھا۔ اس طرح جب سلیمانؑ گر پڑا تو جنوں پر یہ بات کھل گئی کہ اگر وہ غیب کے جاننے والے ہوتے تو اِس ذلت کے عذاب میں مبتلا نہ رہتے۔" اِس آیت کی تشریح میں حاشیہ نمبر ۲۴ پر مولانا مغفور نے زمانۂ جدید کے ان مفسرین کی رائے سے اختلاف فرمایا ہے جو یہ تاویل کرتے کرتے ہیں کہ اس سے مراد حضرت سلیمانؑ کا بیٹا رجعام ہے جو انتہائی نالائق ہونے کی وجہ سے اپنے جلیل القدر والدِ گرامی کی عظیم الشان سلطنت کو نہ سنبھال سکا اور اُس کی جانشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد اس سلطنت کا قصر دھڑام سے زمین پر آ رہا۔" یہاں مولانا نے زبردست عقلی دلائل سے اِس تاویل کو رَد کرتے ہوئے اس کیفیت کو صورتِ واقعہ قرار دیا ہے جو آیت کے ترجمے سے مترشح ہوتی ہے۔ بادی النظر میں ایک قاری اس عقلی استدلال سے واقعی مطمئن ہو جاتا ہے لیکن ذرا غور کرنے پر یہی عقل ایک سوال سامنے لا کھڑا کر دیتی ہے اور وہ سوال یہ ہے کہ اللہ کا ایک برگزیدہ نبی اور ایک عظیم الشان سلطنت کا بادشاہ اپنے تمام کارہائے نبوت اور انتظاماتِ ملکی ترک کر کے

ایک قصر کی تعمیر و نگرانی میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اس کی بے پایاں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔ اور پھر بھی لوگ اس غیر فطری صورتِ حال سے نہیں چونکتے؟ بے شک ذمہ داریوں کی حد تک یہ توجیہہ کی جا سکتی ہے کہ انھوں نے اپنا کوئی نائب مقرر کر کے فراغ حاصل کر لیا ہو گا۔ لیکن اس پہلو کی تشنگی کیسے بجھے گی کہ ایک معروف ترین اور جلال و شکوہ کا پیکر انسان اچانک ایک دن تمام ذمہ داریاں تج کر ایک جگہ کھڑا ہو جاتا ہے، نہ وہ لیٹتا ہے، نہ سوتا ہے، نہ کچھ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ اسے حوائج ضروریہ لاحق ہوتی ہیں حتیٰ کہ وہ ہلتا جلتا نہیں ہے۔ اور یہ کیفیت دو چار لمحے کے لیے نہیں بلکہ ہفتوں یہی صورت برقرار رہتی ہے۔ اور رعیت کے کسی انسان یا جن کو شبہہ تک نہیں ہوتا کہ موصوف زندہ ہے یا مردہ۔ ظاہر ہے کہ سیدنا سلیمان کی وفات سے لے کر عصا کو گھن لگ کر گرنے میں کم از کم ہفتوں کا وقفہ درمیان رہا ہو گا ایسی عظیم ہستی کے تو چند گھنٹے بھی خلافِ معمول گزرنے مستبعد نظر آتے ہیں کجا کہ ہفتے، مہینے۔ آخر یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے براہ کرم وضاحت فرمائیں۔

۲۔ سورہ یوسف کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یوسفؑ کے بھائی حصولِ اناج کے لیے مصر آتے ہیں تو سیدنا یوسفؑ تو انہیں پہچان جاتے ہیں، لیکن برادرانِ یوسفؑ آنجناب کو نہیں پہچان پاتے۔ اور حضرت یوسفؑ ان کے علم میں لائے بغیر ان کے اناج کے توڑوں میں وہ پونجی بھی رکھوا دیتے ہیں جس کے عوض میں وہ حضرات اناج حاصل کر کے لے جا رہے ہیں۔ برادرانِ یوسفؑ اپنے مستقر پہ پہنچ کر جب اناج کے بوجھے کھولتے ہیں تو ان میں اپنی پونجی بھی موجود پاتے ہیں۔ اور خوش ہو کر اپنے والد گرامی حضرت یعقوبؑ سے کہتے ہیں کہ "اے ابا جان! ہمیں اور کیا چاہیے۔ ہماری خرچ کردہ پونجی واپس ہو گئی ہے۔ اب ہم اور رسد لائیں گے"۔ یہاں مجھے یہ سوال پریشان کیے ہوئے ہے کہ گو حضرت یوسفؑ نے جان بوجھ کر بھائیوں کے علم میں لائے بغیر یہ رقم رکھوا دی تھی لیکن برادرانِ یوسفؑ کو اور حضرت یعقوبؑ کو تو علم نہ تھا کہ یہ رقم دانستہ لوٹائی گئی ہے۔ ایسی صورت میں دیانت و امانت کا بنیادی تقاضا تو یہ تھا کہ غلط فہمی

یا سہو سے واپس آئی ہوئی اس رقم کو امانت سمجھا جاتا۔ اور اس کے واپس کرنے کی تدبیر کی جاتی۔ لیکن حیرت ہے کہ ایک جلیل القدر پیغمبر بھی اس پہلو پر غور نہیں فرماتے۔ قرآن کریم یا کسی روایت میں قطعاً کوئی اشارہ ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہو کہ حضرت یعقوبؑ نے اس رقم کو لوٹانے کا کوئی ارادہ کیا ہو یا خیال بھی ظاہر کیا ہو۔

۳۔ تاریخ اسلام کا ایک بہت ہی مشہور واقعہ ہے کہ ایک مسلمان اور ایک یہودی نے دربارِ رسالتؐ میں حاضر ہو کر اپنا تنازعہ پیش کیا۔ آنحضرتؐ صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعات معلوم کر کے فیصلہ یہودی کے حق میں دیا۔ واپس آتے ہوئے اس مسلمان منافق نے معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس لے جانے کو کہا اور جب یہ دونوں حضرات حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوئے اور عمر فاروق کو یہ معلوم ہوا کہ اس قضیے کا فیصلہ قبل ازیں آنحضرتؐ فرما چکے ہیں تو آپ نے اس منافق مسلمان کا سر قلم کر دیا۔ اِسی واقعہ کی بنا پر دربارِ رسالتؐ سے حضرت عمرؓ نے فاروق کا خطاب پایا۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے آخر کس اختیار کی بنا پر ایک شخص کی گردن ماری جب کہ اسلام کا ایک باقاعدہ عدالتی، شہادتی اور تعزیری نظام ہے۔

جواب:۔ آپ نے جس اہتمام سے اپنے اعتراضات اور اندیشہ ہائے دُور و دراز کی عمارت تعمیر کی ہے اُن کا جواب اگر تفصیل سے دینے کی کوشش کی جائے تو وہ بھی کم از کم ایک کتابچے کی شکل اختیار کر لے گا، تاہم میں مختصراً آپ کے اشکالات کا جواب عرض کرتا ہوں:۔

۱۔ قرآن مجید کی آیات یا تفہیم القرآن کے حواشی میں یہ مضمون بیان نہیں ہوا کہ حضرت سلیمانؑ اپنے تمام کار ہائے نبوت اور انتظامِ ملکی کو ترک کر کے ایک قصر کی تعمیر و نگرانی میں ایسے منہمک ہو گئے کہ دوسری بے پایاں ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ قرآن مجید میں صرف یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے لیے بعض جنّات کو (جو غالباً سرکش اور کافر ہوں گے) ایسا مسخر کر دیا تھا کہ وہ حضرت سلیمانؑ کے لیے عمارتیں اور دھات کی دیگیں وغیرہ بناتے تھے۔ اس کام میں حضرت سلیمانؑ کے لیے شب و روز کسی لمبے عرصے تک ایک ہی جگہ بیٹھ کر نگہداشت کرنا ضروری نہیں تھا۔ البتہ ایسا ہونا اغلب ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کسی روز کسی متعین مقام پر تشریف فرما

ہو کر جنات کو مصروفِ کار دیکھ رہے ہوں گے کہ اُن کے اوپر قضائے اجل وارد ہو گئی۔ اُن کے ہاتھ میں جو عصا ہو گا وہ اگرچہ چند گھنٹے بھی غیر متحرک رہا ہو تو اُسے دیمک نے چاٹ لیا ہو گا اور یہ ہمارا اپنا مشاہدہ ہے کہ بعض اوقات کوئی چیز تھوڑی دیر تک زمین پر رکھی رہے تو اُسے دیمک لگنا شروع ہو جاتی ہے۔ مولانا مرحوم یا بعض دوسرے علماء نے اگر گھن کا لفظ استعمال کیا ہے تو اس سے مراد بھی دیمک ہی ہے۔ قرآن مجید کے الفاظ دآبۃ الارض (زمین کا جانور) اس کے لیے واضح قرینہ ہے۔ اگر عصا کا نچلا حصہ دیمک خوردہ ہو گیا اور اُدھر ہاتھ کی گرفت بھی ڈھیلی پڑ گئی ہو گی تو عصا زمین پر آ رہا ہو گا۔ اور جسد مبارک بھی ڈھلک گیا ہو گا۔ جنات چونکہ حضرت سلیمانؑ ہی کے لیے مسخر تھے، اس لیے انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہو گا۔ اور یہ سوچا ہو گا کہ اگر حضرت سلیمانؑ کی موت کا پتہ انہیں بروقت چل جاتا تو وہ اسی وقت اس مشقت سے چھوٹ جاتے۔ بہر حال اس سارے سلسلۂ واقعات کے لیے ہفتوں اور مہینوں کا وقفہ ضروری نہیں، چند ساعتوں میں یہ سب کچھ رُونما ہو سکتا ہے۔

۲۔ جب مصر میں قحط پڑا تو غالب امکان اس کا ہے کہ جزیرہ نمائے سینا اور فلسطین بھی قحط کی زد میں آ گئے ہوں گے۔ اور سارے قحط زدہ علاقوں میں یہ خبر پھیل چکی ہو گی کہ مصر میں غلّے کے پُرانے ذخائر موجود ہیں۔ اور وہاں کے حکمران نہ صرف اپنے شہریوں کو بلکہ دوسرے قحط زدہ علاقوں کے باشندوں کو بھی غلّہ تقسیم کر رہے ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں تو آپ نے بہت سے اشکالات سوچ لیے ہیں لیکن یہ نہیں سوچا کہ اُن کے صاحبزادے حضرت یوسفؑ جو نبی تھے اُنہوں نے غلّے کی خرید و فروخت کا کوئی باقاعدہ کاروبار نہیں شروع کر رکھا ہو گا۔ بلکہ امر زیادہ قرین قیاس ہے کہ جو مستحق بھی اُن کے پاس آتا ہو گا وہ اس کی احتیاج کی تحقیق کے بعد اس کی ضرورت بلا معاوضہ یا بالمعاوضہ پوری کر دیتے ہوں گے۔ اُن کے بھائی اگر کچھ تھوڑی بہت پونجی لاتے ہوں گے تو وہ بھی غالباً بطور ایک ہدیہ کے پیش کی ہو گی اور حضرت یوسفؑ نے بھی شاید پورے ناپ تول اور حساب کتاب کے ساتھ اُن سے معاملہ نہیں کیا ہو گا۔ وہ زیادہ سے زیادہ گنتی کے چند درہم یا دینار ہوں گے اور جب فلسطین پہنچ کر انہوں نے دیکھا ہو گا کہ ہماری پونجی بادشاہ نے چپکے سے ہمارے سامان میں رکھ دی ہے تو انہوں نے یہی سمجھا ہو گا کہ انہوں نے قصداً ہمارے سامنے اسے ہمارے

انھیں واپس کرنا مناسب نہیں سمجھا کہ یہ ایک طرح سے تحفہ و ہدیہ کی تحقیر و توہین ہے۔ اب اس کے بعد کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حضرت یعقوب فوراً انہیں کہتے کہ سینکڑوں میل اُلٹے چل کے جاؤ اور اس نقدی کو اُن تک پہنچاؤ۔ جب کہ یہ بات واضح تھی کہ حضرت یوسفؑ نے دانستہ اُسے اپنے پاس رکھنے اور اُسے واپس کرنے کے لیے ایک اسلوب اختیار کیا۔ حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے جو کچھ کہا، اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب بادشاہ نے ہمارے معاملے میں اتنے حُسنِ سلوک اور فیاضی کا ثبوت دیا ہے تو جب ہمیں دوبارہ غلّے کی ضرورت ہوگی تو پھر جائیں گے، اپنے بھائی کو بھی سامنے لے جائیں گے اور دوبارہ سارا ہدیہ پیش کر دیں گے۔ بائیبل کا بیان یونہی ہے کہ باپ بیٹے اس نقدی کو بوروں میں پاکر سہم گئے اور باپ نے کہا کہ اسے واپس لے جاؤ۔ بعض مفسرین نے بھی اسے بیان کیا ہے۔ لیکن فی الواقع اگر یہی صورت ہوتی تو یہ قصّے کا ایک اہم جزو تھا، جس کا قرآن میں حذف ہونا مستبعد تھا۔ واللہ اعلم۔

۳۔ یہودی اور حضرت عمرؓ کا جو واقعہ آپ نے لکھا ہے یہ پڑھا تو مَیں نے بھی ہے لیکن چونکہ حوالہ آپ نے بھی نہیں دیا، اس لیے اسے تلاش کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ لیکن اس واقعہ کی ایک روایت ایسی بھی میری نظر سے گزری ہے جس میں فقط حضرت عمرؓ کا تلوار نکال لینا مذکور ہے۔ اس میں منافق کے سر قلم کر دینے کا ذکر نہیں ہے۔ اور حضرت عمرؓ چونکہ سخت گیر انسان تھے۔ لہٰذا اُن کے بارے میں تلوار نکال لینے کے اور بھی کئی واقعات مذکور ہیں۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ ایک آدمی اگر مسلمان ہونے کا مدعی ہو اور اُس کے بعد اُسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ قابلِ قبول نہ ہو تو اُس کا یہ فعل ارتداد کی تعریف میں بھی آسکتا ہے۔ اور اس لیے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اُسے مُرتد اور واجب القتل سمجھ کر اس کا خاتمہ کر دیا ہو۔ مگر ہر خلیفہ کی حکم عدولی اور سرتابی پر یہ سزا نہیں دی جاسکتی۔ کسی دوسرے حاکم یا خلیفہ کے معاملے کو آنحضورؐ پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ خلفائے راشدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا گیا اور اُن پر بعض لوگ سبّ و شتم تک کرتے تھے، بعض اُن کی بیعت میں متامل تھے۔ لیکن خلفائے راشدین نے انہیں واجب القتل نہیں سمجھا اور سامنے ہی یہ فرمایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر کوئی سبّ و شتم کرے یا اسلام لانے کے بعد آنحضورؐ کی اطاعت سے انکار کر دے تو صرف اُس شخص کو قتل کیا جاسکتا ہے۔

(بقیہ اشارات) ہوتی ہے، مگر مہاجرین کی مشکلات و ضروریات کا کوئی چرچا نہیں ہوتا۔ کاش کہ کچھ لوگ ہمت کر کے نکلیں اور موقع پر خود جا کر ان کے دردناک حالات دیکھیں اور اپنے مشاہدات کو اشاعت میں لائیں۔ ایک چھوٹی سی تصویرِ احوال پیشِ خدمت ہے جو ڈاکٹر عبدالوارث صاحب کی مشاہداتی رپورٹ سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے بلوچستان میں مہاجرین کے ایک کیمپ میں کام کیا۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:۔

—— دو زخمی مجاہدین کے بارے میں جو وارڈ نمبر ۱، ۲ میں داخل اور زیرِ علاج ہیں، بہت متفکر ہوں۔ بینوپچ نامی مجاہد (عمر ۲۲ سال) جن کی ریڑھ کی ہڈی میں سات ماہ پیشتر دشمن کی گولی پیوست ہو گئی تھی، اب تک لاعلاج پڑے ہیں...... نچلا دھڑ بالکل بے حس ہو گیا۔ کراچی کے ماہرین سے مشورے لیے اور یہ جواب ملا کہ یہ تو لاعلاج ہے۔

—— دوسرے ۳۰ سالہ نوجوان ہشاش بشاش مسکراتا چہرہ مگر قوتِ گویائی سے محروم، قندی آغا بے حس و حرکت پڑے چمکتی ہوئی آنکھیں اِدھر اُدھر گما رہے ہیں...... سوائے آنکھوں اور کان کے باقی سارے حواس معطل ہیں۔

—— پرسوں ہی قندھار اور گرد و نواح کی آبادی پر انتہائی وحشیانہ بم برسائے گئے ہیں...... مرد سارے پہاڑوں میں تھے...... عورتیں بھاگیں، بچوں نے گھر چھوڑے، ننگے پاؤں ننگے سر ۳۴ عورتیں، ۷۶ بچے بارڈر پار کر کے چمن پہنچ گئے۔ ۱۱۰ افراد کے اس گروہ میں ۱۰ سال سے کم عمر کے بچے اور عورتیں ہیں، جوان یا بوڑھا کوئی ایک مرد بھی ساتھ نہیں ۱۴ عورتیں راستہ بھٹک گئیں یا دشمن کے ہاتھ آ گئی ہیں۔ (ایک شیر خوار بچہ راستے میں گر گیا)۔

—— صبح ۲ ستمبر ۸ بجے مہاجر کیمپ پہنچا۔ ایک نیا قبرستان بن چکا تھا۔ ۶۰، ۷۰ قبریں ہیں، تیس افراد ہیضہ سے لقمۂ اجل بن گئے ہیں...... درجنوں مریض دیکھے۔ جوان بھی، بوڑھے بھی، عورتیں اور بچے بھی۔ اسہال ہے، قے ہے، چہرے سفید، جسم بے حس و حرکت، آنکھیں کھڑی کہیں دُور گھور رہی ہیں اور ہونٹ خشک...... کچھ بوڑھے اپنے نیم جاں مریضوں کے سرہانے بیٹھے یٰس شریف کی تلاوت کر رہے ہیں، بچے رو رہے ہیں، بلبلا رہے ہیں، کچھ مریض، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عالمِ نزع میں ہیں۔

——— میں اور میرا کمپونڈر جھونپڑیوں اور خیموں میں ڈرپ (DRIP) لگا رہے ہیں .... رات ہو گئی، لیکن نہ تو کہیں دیا جلا نہ آگ۔ ایک مریض دیکھ کر انجکشن تیار کیا۔ لگانے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے مگر ندارد۔

——— ایک مریض کے لیے کہا: رات کو چاول کھلاؤ " ڈاکٹر صاحب، یہاں تو پانی میسر نہیں، بچوں کو روٹی میسر نہیں، آپ چاول کی بات کرتے ہیں، کہاں سے لائیں، کیا دے کر لائیں "۔ جواب تھا۔

میں نے تاسف سے پوچھا: کیوں آپ کو راشن نہیں ملتا؟ جواب تھا: دو ماہ پہلے ملا تھا، صرف گندم ۱۲ سیر۔

——— اور پانی کا بندوبست؟ میں نے پوچھا۔

(پانی جو دکھایا گیا اس کا حال یہ تھا)

چھوٹے سے نالے میں گدلا پانی بہہ رہا ہے۔ ترش، تلخ اور بہت تھوڑا سا۔

——— دور سے دو گاڑیاں سی اڑتی آ رہی تھیں۔ نزدیک آئیں، بچے، بوڑھے، عورتیں ایک دوسرے کے اوپر نیچے۔ یہ ابھی ابھی افغانستان سے پہنچے ہیں۔ کہاں رہیں گے؟

پتہ نہیں!

کیا اس چھوٹی سی جھلک سے پاکستان کے خوشحال اصحاب کو مہاجرین کی مصیبت، ان کے مسائل اور ان کی ضروریات کا کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ ہمارے یہاں کا مٹی ڈھونے والا مزدور ہو یا نہ ابھکاری، ان سے سو درجے بہتر حالات میں ہے۔

یہ لوگ جو آج مہاجرت کی مصیبت کی بھٹی میں تپ رہے ہیں، یہ بھی اپنے گھروں میں معزز اور خوددار لوگ تھے، ان کے تعلقات کے دائرے ہوں گے، ان کے قبیلے اور خاندان باغوں اور کھیتوں اور ریوڑوں کے مالک رہے ہوں گے۔ آج ظلم کی ایک خونیں لہر نے انہیں اٹھا کر ہمارے پاس لا پہنچایا ہے۔

آج ان مظلوم اور مصیبت زدہ بھائیوں بہنوں اور ان کے معصوم بچوں کے لیے ہمارے سینوں

ہیں حساس دھڑکتے دل اور ہماری آنکھوں میں آنسو ہونے چاہئیں۔

مجھے معلوم ہے کہ بعض خوشحال حضرات یا ان کی فرمیں خاموشی سے مہاجرین کی کم یا زیادہ خدمت کر رہے ہیں۔ لیکن یہ مثالیں تھوڑی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کو احساس ہو جائے تو دس دس مہاجر کنبوں کے یا متعدد خیموں کی مخلوق کے پورے مصارف کی ذمہ داری سال چھ ماہ کے لئے بہ سہولت اٹھا سکتے ہیں۔ کئی اصحاب چاہیں تو تاریخ کی جھولی میں ایسی زریں مثالیں ڈال سکتے ہیں کہ وہ اپنے مال و متاع کا آدھا حصہ مظلوم مہمانوں کے لئے الگ کر دیں۔ منظر آج یہ ہونا چاہیئے تھا کہ شہری اور دیہاتی لوگ نقدی کے علاوہ غذائی سامان اور برتن، لحاف اور لبستر، گرم کپڑا اور کمبل، دوا دارو اور ٹیکے، لالٹینیں اور ماچسیں خرید خرید کر مہاجرین کو بھجوا رہے ہوتے۔ ہر کسی کو سردی میں ٹھٹھرنے والوں کا دکھ ہو۔ ہر کسی کو سسکتے بچوں کا احساس ہو، ہر کسی کو پریشان حال خواتین کی آزمائش کا اندازہ ہو، ہر کسی کو زخمیوں اور مریضوں سے ہمدردی ہو۔ پوری قوم افغان مہاجرین کو یہ محسوس کرا دے کہ پاکستان میں چاروں طرف ان کے کروڑوں بھائی اور خادم بستے ہیں۔

یوں ہو تو مدینہ کے انصار کی قائم کردہ مقدس روایت پھر تازہ ہو کر سامنے آسکتی ہے اور اس کی برکات مہاجرین ہی کو نہیں، خود ہمیں لوٹ کر ملیں گی۔ ہم پر جو دولت پرستی اور اسراف و تبذیر کا عذاب آیا ہوا ہے شاید یہ ٹل جائے۔

اصل میں کروڑوں انسانوں میں محض اپیلوں اور مضامین سے عمومی حرکت پیدا نہیں ہوتی۔ ضرورت "چند دیوانوں" کی بھی ہوتی ہے۔ جو اپنے پاس سے جو کچھ دے سکتے ہوں وہ بھی دیں، اور پھر گلی گلی، محلے محلے نکل کھڑے ہوں اور بلا امتیاز ہر دروازے کو کھٹکھٹائیں۔ نقد رقوم یا ضروری سامان و اجناس میں سے جو کچھ مل سکے اسے شہر شہر اور گاؤں گاؤں جمع کریں اور باقاعدہ رسیدیں دیں۔ اس طرح اعانتِ مہاجرین کی ایک تحریک ملک بھر میں چل پڑے گی۔

جو کچھ جمع ہو، اسے قابلِ اعتماد ادارے یا انتظام کے ذریعے مہاجرین کے کیمپوں تک پہنچایا جائے۔ ایسے بندگانِ خدا اپنے ساتھ مناسب پمفلٹ رکھ سکتے ہیں، جہادِ افغانستان کی اہمیت پہ بات کر سکتے ہیں، روسی جارحیت کے موضوع پر حقائق کو واضح کر سکتے ہیں۔ مہاجرین کی تکالیف اور ضروریات بتا سکتے

ہیں اور سوالات اور اعتراضات کے جواب دے سکتے ہیں۔

زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ کسی دروازے پر جائیں تو وہاں سے کچھ نہ ملے یا کورا جواب ملے یا اذیت ناک باتیں سننی پڑیں۔ ایسا کہیں کہیں ہو سکتا ہے مگر اکثریت ایسی ہے کہ اگر خدا ترس، قابلِ اعتماد اور دیانت دار لوگ مہم پر نکلیں تو انہیں ہزار مثبت جواب ملے گا اور اس مقصد سے اٹھایا ہوا ایک قدم اور زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ کتنے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ ہوگا۔ جس نے انکار، اعراض یا گالیوں پر صبر کر لیا، اس نے تو آخرت کے لئے بڑی کمائی کر لی۔

جو لوگ یہ کام کریں انہیں اس جذبے سے نکلنا چاہیئے کہ وہ خدا کی راہ میں دین کا ایک تقاضا پورا کرنے کے لئے نکل رہے ہیں۔ وہ صلہ و نمائش اور ریا سے بالاتر ہیں۔ وہ اس درجہ محتاط ہوں کہ نقود میں سے ایک پیسہ اور اجناس میں سے ایک ذرہ بھی ادھر اُدھر نہ ہونے پائے۔ ساری امانت حقداروں تک پہنچے۔

یہ کام اگر یہاں ٹھیک سے کیا جائے تو اس کے ذریعے عوام میں ایک نیا ایمانی و اخلاقی احساس بیدار کیا جا سکتا ہے۔ معاشرے میں اصلاح و تعمیر کے رجحان کو ترقی دی جا سکتی ہے اور پوری قوم خدا کی رحمتوں کی مستحق ہو سکتی ہے یا کم سے کم اس کی طرف سے کسی سخت گرفت سے بچ سکتی ہے۔

ایسا عنصر کوئی ہے تو وہ قدم آگے بڑھائے۔ نہیں ہے تو پھر یہ سمجھنا چاہیئے کہ بہ حیثیت ایک مسلم قوم کے ہم میں زندگی باقی نہیں ہے۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔